مخلوط انتخاب

منشورات

جولائی 2000

فیسر خورشید احمد

profkhurshidahmad.com all rights reserved

مخلوط انتخاب

پاکستان کی نظریاتی بنیادوں پر حملہ

پروفیسر خورشید احمد

منشورات

ہدیہ - 5 روپے
سیکڑہ پر خصوصی رعایت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کسی پہلو سے بھی اسے ایک قوم کی خوش بختی قرار نہیں دیا جا سکتا کہ اس کا ایک بااثر طبقہ طے شدہ امور کو بار بار متنازع بنانے کی کوشش کرے اور ملک و ملت کو ایک نہ ختم ہونے والے بحث و مباحثے میں الجھائے رکھ کر ذہنی فضا کو مسموم اور پراگندہ (confuse) کرنے کا مرتکب ہو۔ جو دانش ور، صحافی اور سیاست کار اس کے مرتکب ہو رہے ہیں، ان کی مثال، قرآن کی زبان میں، اس عورت کی سی ہے جس نے آپ اپنی محنت سے سوت کاتا اور پھر آپ ہی اسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا جس سے اللہ نے پناہ کا حکم دیا ہے (وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا ط النحل ۱۶:۹۲)۔

پاکستان کو مسلمانوں کی حالیہ تاریخ میں ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ یہ ملک ایک شعوری اور عوامی جمہوری تحریک کے نتیجے میں وجود میں آیا ہے اور یہ تحریک برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کی جدوجہد تھی۔ بلاشبہ پاکستان ان تمام انسانوں کا ملک ہے جو یہاں آباد ہیں اور ایک اجتماعی معاہدے کے تحت سب کے حقوق محترم ہیں لیکن اس حقیقت سے صرف نظر ممکن نہیں کہ یہ ملک نہ کسی فوجی کارروائی کے تحت وجود میں آیا اور نہ ہی اس

کے قیام میں برعظیم کے مسلمانوں کے علاوہ کسی دوسری قوم یا گروہ کا کوئی حصہ تھا۔ پھر یہ صرف ان مسلمانوں کی کاوش کا حاصل بھی نہیں جو ان علاقوں کے باسی تھے اور جہاں آزادی کا سبز پرچم لہرایا بلکہ یہ جدوجہد برعظیم کے تمام مسلمانوں نے کی اور یہ ملک ان سب کی قربانیوں کا حاصل ہے اور اس پر سب کا برابر کا حق ہے۔ سب سے بڑھ کر، یہ محض ایک علاقے کی آزادی کا مسئلہ نہ تھا بلکہ برعظیم کے سیاسی مسئلے کا ایک حل اور برعظیم میں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کے لیے ایک واضح منزل اور اس تک پہنچنے کے لیے ایک کھلی شاہراہ کے حصول کی جدوجہد تھی۔ یہ تحریک اللہ، ملت اسلامیہ پاکستان اور خود تاریخ سے ایک عہد اور میثاق تھی جس کے نتیجے میں پاکستان کی آزاد مسلم مملکت وجود میں آئی۔

تقسیم ہند کا منصوبہ واضح طور پر نظریاتی بنیادوں پر تقسیم ملک کی تقسیم کا عمل تھا جسے برطانوی حکومت، مسلمانان پاک و ہند اور کانگریس نے طویل بحث و مجادلہ اور افہام و تفہیم کے بعد قبول کیا اور ایک عمرانی معاہدے کے ذریعے دو آزاد مملکتیں وجود میں آئیں جن کا اپنا اپنا واضح تشخص تھا۔ پاکستان کے اسی تشخص کو قرارداد مقاصد اور پھر ۱۹۵۶ء اور ۱۹۷۳ء کے دستور میں قانونی اور عملی شکل دی گئی۔ اس کے تین ستون ہیں جو ملت کے اجماع کا مظہر ہیں: یعنی مملکت کا اسلامی تشخص، اس کا جمہوری کردار اور اس کا وفاقی نظام۔ یہ تینوں بنیادیں متفق علیہ اور غیر متنازع ہیں۔ یہ باہم مربوط اور ایک دوسرے کی مضبوطی کا باعث ہیں اور ان کی اہمیت اسی ترتیب سے ہے جس میں یہ قرارداد مقاصد اور دستور میں مرقوم ہیں۔ کوئی ایسا اقدام جو ان میں سے کسی کو بھی مضمحل یا کمزور کرے یا جس کے نتیجے میں ان میں کوئی شگاف آجائے وہ پاکستان اور اس کی متفقہ علیہ بنیادوں سے بے وفائی اور تحریک پاکستان کے شہدا سے غداری کے مترادف ہے۔ ہر قوم کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی بنیادوں کی حفاظت کرے اور جو بھی ان پہ تیشہ چلانے کی جرات کرے، اس ہاتھ کو کاٹ ڈالے اور اس کی ضرب کو غیر مؤثر بنا دے۔

طریق انتخاب کا مسئلہ

طریق انتخاب کا مسئلہ ان تینوں بنیادوں سے متعلق ہے۔ جو حضرات بڑا معصوم چہرہ بنا کر محض لبرل جمہوریت اور مساوات کے نام پر جداگانہ انتخاب کی جگہ مخلوط انتخاب کی بات کر رہے ہیں وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر پاکستان کی بنیادوں پر تیشہ چلا رہے ہیں اور انھیں یہ کھیل کھیلنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ ناموس رسالتؐ کے سلسلے میں بھی یہی کھیل کھیلا گیا اور اب طریق انتخاب کے سلسلے میں ایسی ہی مذموم کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ ساری حرکتیں ایک مخصوص گروہ کی طرف سے ہو رہی ہیں جو کبھی جمہوریت کی دہائی دیتا ہے، کبھی دعویٰ کرتا ہے کہ ان امور کا کوئی تعلق دین سے نہیں، کبھی اقلیتوں کے حقوق کی دہائی دی جاتی ہے اور کبھی بنیادی حقوق کا واویلا کیا جاتا ہے۔ حد یہ ہے کہ خواتین کمیشن کی رپورٹ میں بھی یہ شوشہ چھوڑنے سے گریز نہیں کیا جاتا۔ اس سلسلے میں وہ طبقہ سب سے زیادہ پیش پیش ہے جو این جی اوز کے روپ میں مغربی تہذیب اور اقدار کو فروغ دینے کے لیے سرگرم ہے اور جسے عالمی سیکولر قوتوں کی پشت پناہی حاصل ہے لیکن پاکستان ان تمام قوتوں کے علی الرغم اللہ کے فضل و کرم اور مسلمانان برعظیم کی عوامی جدوجہد کے ذریعے وجود میں آیا ہے اور ان شاء اللہ تمام ریشہ دوانیوں کے باوجود اپنی اصل بنیادوں پر قائم رہے گا۔ البتہ ہر فتنے کو سمجھنا اور اس کا مقابلہ کرنا ضروری ہے کہ یہی وہ راستہ ہے جس سے زندہ قومیں اپنے مقاصد اور عزائم کی تکمیل کرتی اور ان کی حفاظت اور ترقی کا سامان کرتی ہیں۔

تاریخی پس منظر

برعظیم کی تاریخ میں طریق انتخاب کے مسئلے نے بیسویں صدی کے شروع ہی میں اہمیت اختیار کر لی تھی۔ جب سرکاری اداروں میں عوامی نمایندگی کا سوال اٹھا تو فطری طور پر یہ سوال سامنے آیا کہ کس کی نمایندگی کون کرے گا اور اس کے لیے اصل اور بنیاد کیا

ہوگی؟ انگریز اور کانگریس کی ہندووانہ سیکولر قیادت تمام ہندستانیوں کے لیے ایک ہی طریق انتخاب کی بات کر رہے تھے جب کہ مسلمان اس بات کے دعوے دار تھے کہ وہ ایک جدا قومی تشخص کے حامل ہیں اور چونکہ ان کے مقابلے میں ہندو آبادی تین گنا زیادہ ہے اس لیے مذہب، تہذیب و ثقافت اور جداگانہ قومی مفاد کو نظرانداز کرکے ایک نام نہاد نیوٹرل (neutral) بنیاد پر مخلوط انتخاب کا طریقہ عملاً ان کو حق رائے دہی سے محروم (disenfranchisement) کرنے کے مترادف ہوگا۔ ابھی تقسیم ملک کی کوئی بات نہیں اٹھی تھی اور ہندو مسلم اتحاد کی لے بڑے اونچے سروں میں بلند کی جا رہی تھی لیکن شرکت اقتدار اور انتخاب کی بات کے اٹھتے ہی مسلمانوں نے اپنے جداگانہ تشخص کا اظہار کیا اور بالآخر ۱۹۰۹ء میں مشترک بیلٹ کی جگہ جداگانہ نمایندگی کے اصول کو تسلیم کیا گیا۔ سائمن کمیشن اور نہرو رپورٹ (۲۹-۱۹۲۸ء) کے موقع پر پھر یہ مسئلہ پوری قوت سے اٹھایا گیا۔ کانگریس اور خصوصیت سے پنڈت نہرو نے اس کی زبردست مخالفت کی لیکن مسلمانوں نے اپنے جداگانہ تشخص پر کوئی سمجھوتہ نہ کیا۔ بعض مسلمان قائدین جو قبل ازیں اس بارے میں متردد تھے، وہ بھی اب کھل کر اس کی تائید میں سینہ سپر ہو گئے اور مسلمان قوم کے اجتماعی فیصلے کو تسلیم کرانے کے لیے ڈٹ گئے بلکہ اس کے منطقی تقاضے یعنی مسلم اکثریت اور ہندو اکثریت کی بنیاد پر ملک کی تقسیم کے نصب العین پر جمع ہونے لگے۔

مذہبی اہمیت

سیکولر قوتوں کا موقف یہ تھا کہ مذہب ایک انفرادی معاملہ ہے۔ اس کا سیاست، ریاست اور انتخابی عمل سے کوئی تعلق نہیں جبکہ مسلمانوں کا موقف یہ تھا کہ ان کا مذہب محض انفرادی عقیدے اور عبادات تک محدود نہیں بلکہ وہی ان کی اجتماعیت کی بنیاد، ان کی قومیت کی اساس اور ان کے اجتماعی کردار کا صورت گر ہے۔ مغرب کی لبرل اور سیکولر

جمہوریت مسلمان کی منزل نہیں ہو سکتی۔ مسلمان جس جمہوریت کے قائل ہیں وہ اللہ کی حاکمیت اور شریعت کے فریم ورک میں قائم ہوتی ہے اور دین اور سیاست دو جداگانہ دنیاؤں سے متعلق نہیں بلکہ ان کی سیاست بھی دین کی اسی طرح پابند ہے جس طرح ان کی عبادت۔ اقبال نے اس نکتے کو بڑی خوبی سے ادا کیا ہے:

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسولؐ ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

اقبال اور قائداعظم کا نقطۂ نظر

اقبال نے اپنے ۱۹۳۰ء کے تاریخی خطبے میں تو گویا سمندر کو کوزے میں بند کر دیا۔ انھوں نے مغربی فکر و تہذیب اور اسلامی نظریہ اور تاریخ کے فرق کو بڑے واضح انداز میں بیان کیا جو تحریک پاکستان کی بنیاد اور اس کی علت غائی (raison detre) بن گئی:

سوال یہ ہے کہ آج جو مسئلہ ہمارے پیش نظر ہے اس کی صحیح حیثیت کیا ہے؟ کیا واقعی مذہب ایک نجی معاملہ ہے اور آپ بھی یہ چاہتے ہیں کہ ایک اخلاقی اور سیاسی نصب العین کی حیثیت سے اسلام کا بھی وہی حشر ہو جو مغرب میں مسیحیت کا ہوا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اسلام کو بطور ایک اخلاقی تخیل کے تو برقرار رکھیں لیکن اس کے نظام سیاست کی بجائے ان قومی نظامات کو اختیار کر لیں جن میں مذہب کی مداخلت کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا.....

لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واردات مذہب کی حیثیت جیسا کہ قرآن

پاک میں ان کا اظہار ہوا ہے' اس سے قطعاً مختلف ہے۔ یہ محض حیاتی نوع کی واردات نہیں ہیں کہ ان کا تعلق صرف صاحب واردات کے اندرون ذات سے ہو' لیکن اس کے باہر اس کے گردوپیش کی معاشرت پر ان کا کوئی اثر نہ پڑے۔ برعکس اس کے یہ وہ انفرادی واردات ہیں جن سے بڑے بڑے اجتماعی نظامات کی تخلیق ہوتی ہے اور جن کے اولین نتیجے سے ایک ایسے نظام سیاست کی تاسیس ہوئی جس کے اندر قانونی تصورات مضمر تھے اور جن کی اہمیت کو محض اس لیے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی بنیاد وحی و الہام پر ہے۔ لہٰذا اسلام کے مذہبی نصب العین اس کے معاشرتی نظام سے جو خود اسی کا پیدا کردہ ہے' الگ نہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ اگر آپ نے ایک کو ترک کیا تو بالآخر دوسرے کا ترک بھی لازم آئے گا۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی مسلمان ایک لمحے کے لیے بھی کسی ایسے نظام سیاست پر غور کرنے کے لیے آمادہ ہوگا جو کسی ایسے وطنی یا قومی اصول پر مبنی ہو جو اسلام کے اصول اتحاد کی نفی کرے۔

Thoughts and Reflections of Iqbal, p 166-167)

اسلام کے اس مخصوص مزاج اور تاریخی کردار کا تقاضا تھا کہ ریاستی نظام کی بنیاد اسلامی تشخص اور مسلمانوں کی نظریاتی وحدت پر ہو اور اس نظام میں دوسری قوموں اور گروہوں کو ان کے تشخص کے مطابق زندہ رہنے' ترقی کرنے اور اجتماعی کردار ادا کرنے کا موقع دیا جائے۔ مسلم ریاست اسی نظریاتی شعور پر اپنا اجتماعی اور سیاسی نظام قائم کرتی ہے۔ نہ مسلمانوں کے تشخص کو کمزور کیا جاتا ہے اور نہ دوسری قوموں کو اجتماعیت کے نام پر ان کے تشخص سے محروم کیا جاتا ہے۔ یہ یک قومی ریاست نہیں کثیر قومی ریاست (state of nationalities) ہے اور اس طرح ایک معتبر کثیر قومی ہیئت (pluralism) کی بنیاد پر اجتماعی تعاون اور استحکام حاصل کیا جاتا ہے۔ دولت عثمانیہ میں تنظیمات کا نظام اسی کثیر قومی ہیئت کی ایک تاریخی مثال ہے۔ برعظیم میں جداگانہ طریق انتخاب کے ذریعے ایک مختلف سیاسی تناظر میں اسی مقصد کو حاصل کیا گیا اور آزادی کے بعد انھی مقاصد اور

اہداف کے حصول کے لیے پاکستان کے مسلمانوں نے جداگانہ انتخاب کے طریقے کو ایک ایسی شکل دینے کی کوشش کی کہ مسلم قوم کی نمایندگی بھی بھرپور انداز میں ہو سکے اور دوسرے مذاہب اور اقلیتوں کو بھی اپنے عقیدے اور تصورات کے مطابق اپنے میں سے اپنے نمایندے سیاسی اداروں میں بھیجنے کا پورا موقع حاصل رہے۔ اس نظام کی بنیاد کسی غیر فطری امتیاز (discriminaton) پر نہیں بلکہ معاشرے کے حقیقی تنوع کو سیاسی منظر پر رونما ہونے اور اپنا کردار ادا کرنے کا موقع فراہم کرنے کی ایک صحت مند اور منصفانہ کوشش ہے۔ قائداعظم نے اس حقیقت کو بڑے صاف الفاظ میں بیان کیا ہے:

ہم (ہندو اور مسلمان) ہر بات میں مختلف ہیں۔ مذہب میں، تہذیب میں، ثقافت میں، تاریخ میں، زبان میں، فن تعمیر میں، موسیقی میں، قانون میں، معاشرے میں، لباس میں--- ہم ہر لحاظ سے مختلف ہیں۔ ہم بیلٹ بکس کے لیے ایک کیسے ہو سکتے ہیں؟ (نومبر ۱۹۴۵ء)

اس سے پہلے ۱۹۳۸ء میں میمن چیمبرز آف کامرس اور میمن مرچنٹس ایسوسی ایشن کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے بڑی تفصیل سے مسلمانوں کے موقف کی وضاحت کی۔ ایک طرف قرآن کو مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے لیے ہدایت کا سرچشمہ قرار دیا اور دوسری طرف کانگریس کی طرف سے مسلمانوں پر مخلوط انتخاب کو مسلط کرنے کی سازش کا پردہ چاک کیا۔ قائداعظم کا ارشاد تھا:

مسلمانوں کے لیے پروگرام تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ ان کے پاس تو تیرہ سو سال سے ایک مکمل پروگرام موجود ہے اور وہ قرآن پاک ہے۔ قرآن پاک ہی میں ہماری اقتصادی، تمدنی و معاشرتی اصلاح و ترقی کے علاوہ سیاسی پروگرام موجود ہے۔ میرا اسی قانون الٰہی پر ایمان ہے اور جو میں آزادی کا طالب ہوں وہ اسی کلام الٰہی کی تعمیل ہے۔ قرآن پاک ہمیں تین چیزوں کی ہدایت کرتا ہے۔ آزادی، مساوات اور اخوت۔ بحیثیت ایک مسلمان کے میں بھی انھی تینوں کے حصول کا متمنی ہوں۔ قرآنی تعلیم ہی میں ہماری نجات ہے اور اسی کے ذریعے ہم

ترقی کے تمام مدارج طے کر سکتے ہیں۔

کانگریس کی مسلم ماس کنٹیکٹ کی تحریک کا ذکر کرتے ہوئے اس تقریر میں فرماتے ہیں:

کیا اس اسکیم کا یہ مقصد نہیں کہ مسلمانوں کو اپنے کیمپ میں لے کر ایک دن کانگریس جداگانہ انتخاب کو ختم کر دے اور مسلمانوں ہی کی نام نہاد منظوری کی آڑ لے کر سمجھ دار اور عاقبت اندیش مسلمانوں کی مرضی کے خلاف مخلوط انتخاب جاری کر دے۔ اس نے مسلم ممبروں کی مخالفت کے باوجود لوکل باڈیز میں مخلوط انتخاب جاری کرنے کا قانون پاس کیا۔ کیا جمہوری حکومت کا یہی شیوہ ہوا کرتا ہے کہ جس قوم یا فرقے کے لیے چاہے اپنی پسند اور مرضی کے مطابق قانون وضع کرے اور اس قوم و فرقے کے نمایندوں کی مرضی اور منشا کا کوئی لحاظ نہ رکھے؟ ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ جس طرح ہر شخص کو ووٹ کا حق حاصل ہونا چاہیے اسی طرح امیدوار بننے کا حق بھی حاصل ہونا چاہیے۔ مخلوط انتخاب کی صورت میں جو امیدوار کامیاب ہوں گے وہ غیر قوم یعنی اکثریت کے ووٹوں سے کامیاب ہوں گے۔ مسلمانوں کی خواہش ہے کہ ان کا نمایندہ وہ ہو جسے خود مسلمانوں کے زیادہ سے زیادہ ووٹ ملے ہوں، نہ یہ کہ ووٹ تو دوسروں سے ملے ہوں اور وہ نمایندہ مسلمانوں کا ہو" (روزنامہ انقلاب، لاہور، ۱۲ جون ۱۹۳۸ء۔ گفتار قائداعظم، مرتبہ: احمد سعید، ص ۲۱۲-۲۱۶)

قائداعظم کی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء والی تقریر کو اس کے مخصوص سیاسی پس منظر اور قائداعظم کے اسی موضوع پر دو سو سے زیادہ اقوال کو نظرانداز کرکے، ایک گروہ متحدہ قومیت اور مخلوط انتخاب کے حق میں استعمال کرنے کی کوشش کر رہا ہے جو مسلمانوں کی پوری تاریخ، اور خصوصیت سے برعظیم میں قیام پاکستان سے قبل اور اس کے بعد کے حقائق و حالات کے خلاف علم بغاوت ہے۔ طریق انتخاب کے مسئلے کا تعلق ایک قوم اور گروہ کے اس حق سے ہے کہ اس کی نمایندگی وہ افراد کریں جو اس میں سے ہوں اور اس

کے عقائد و نظریات، پروگرام اور عزائم، تہذیب و اقدار اور ترجیحات کی صحیح نمایندگی کر سکیں۔ اس کا تعلق ملک کی شہریت سے نہیں۔ شہری تو ہر عمر کے لوگ ہوتے ہیں لیکن ووٹ کا حق صرف ایک خاص عمر تک پہنچنے والوں ہی کو ملتا ہے۔ اسی طرح مختلف عقائد، تصورات اور تہذیبی و مذہبی تشخص رکھنے والے افراد ملک کے شہری اور برابر کے شہری ہو سکتے ہیں لیکن نمایندگی اور پالیسی سازی پر اثراندازی کے باب میں انصاف کے تقاضے اسی وقت پورے ہو سکتے ہیں جب ہر تہذیبی اور مذہبی کمیونٹی کی نمایندگی اس کے اپنے لوگ کریں۔ اسے حاصل کرنے کے لیے جداگانہ انتخاب کا طریقہ ایک معقول اور فطری طریقہ ہے۔ متناسب نمایندگی کے نظام کے ذریعے بھی یہ مقصد ایک حد تک حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مگر مخلوط انتخاب تو نمایندگی کا وہ بھونڈا اور ظالمانہ نظام ہے جس کے ذریعے دینی، نظریاتی اور تہذیبی تشخص کی نفی ہوتی ہے اور محض ووٹوں کی ہیرا پھیری اور نمبروں کی سیاست کے ذریعے ایک طبقے کو سب پر اپنی بالادستی قائم کرنے کا مؤثر حربہ مل جاتا ہے اور یک رنگی اور مساوات کے نام پر حقیقی تنوع کی مصنوعی نفی کی جاتی ہے۔

آئینی و سیاسی جدوجہد کا محور

مسلمان بحیثیت قوم نہ اس پالیسی کو اس وقت صحیح سمجھتے تھے جب وہ برعظیم میں اقلیت میں تھے اور نہ اس وقت صحیح سمجھتے ہیں جب وہ ایک آزاد مملکت میں اکثریت میں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی اور نظریاتی قوتوں نے جداگانہ طریق انتخاب کو پاکستان کے سیاسی نظام اور دستور میں قائم رکھنے کی کوشش کی اور صرف سیکولر عناصر اور خصوصیت سے کانگریس کے حامیوں اور مشرقی پاکستان کے ہندوؤں نے مخلوط انتخاب کے لیے سازشیں کیں۔ علماے کرام نے ۱۹۵۱ء میں اسلامی ریاست کے جو ۲۲ اصول مرتب کیے ان میں جداگانہ انتخاب کو بنیاد بنایا گیا۔ (ملاحظہ ہو اصول نمبر ۳، ۵، ۱۰ اور ۱۱)۔ اسی طرح ۱۹۵۳ء کی دستوری سفارشات میں علماے کرام نے اسی اصول کی تائید کی۔ خود لیاقت علی خاں کی

بنیادی اصولوں کی رپورٹ (۱۹۵۰ء)' ناظم الدین رپورٹ (۱۹۵۲ء)' محمد علی بوگرہ رپورٹ (۱۹۵۴ء) میں جداگانہ اصول ہی کی سفارش کی گئی۔

مشرقی پاکستان کے ۱۹۵۴ء کے انتخاب اسی اصول پر منعقد ہوئے اور جگتو فرنٹ کے ۲۲ نکات میں بھی مخلوط انتخاب کا کوئی ذکر نہ تھا۔ البتہ ایک بار مشرقی پاکستان کے ہندوؤں کو مشرقی پاکستان اسمبلی اور مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں میں سے سیکولر عناصر سے گٹھ جوڑ کر کے جو توازن طاقت (leverage) حاصل ہوا اس کا فائدہ اٹھا کر انھوں نے اس اصول پر تیشہ چلانے کی کوشش کی۔ ۱۹۵۶ء کے دستور کے تحت اس مسئلے پر رائے دیتے ہوئے مغربی پاکستان کی اسمبلی نے ۳۱۰ ارکان کے ایوان میں ۳۰۰ ارکان کی اکثریت نے جداگانہ انتخاب کے حق میں ووٹ دیا۔ مشرقی پاکستان کی اسمبلی میں مسلمانوں کی اکثریت نے جداگانہ انتخاب کے حق میں ووٹ دیا' البتہ ۶۰ ہندو ووٹوں کا سہارا لے کر عوامی لیگ نے معمولی اکثریت سے مخلوط انتخاب کے حق میں اکثریت حاصل کرلی اور اس طرح نظام انتخاب میں یہ بارودی سرنگ لگ گئی جس نے' جیسا کہ خطرے کا اظہار کیا گیا تھا' بنگالی قومیت کو فروغ دیا اور بالآخر پاکستان دولخت ہوگیا۔ مولانا مودودی نے ۱۹۵۵ء میں اپنے ایک بصیرت افروز مضمون میں اس خدشے کا برملا اظہار کیا تھا کہ اگر مخلوط انتخاب کے طریقے کو ملک پر مسلط کیا گیا تو سب سے پہلے مشرقی پاکستان میں بنگالی قومیت کا فتنہ اٹھے گا اور پھر مغربی پاکستان بھی اس کا نشانہ بنے گا۔

(Islamic Law and Constitution by Maulana Maudoodi, p 331)

ڈاکٹر وحید قریشی اس مسئلے کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> مشرقی پاکستان میں علیحدگی کے رجحانات کو جن عوامل نے تقویت دی ان میں ایک طریقہ انتخاب تھا۔ حکومت پاکستان نے عیسائیوں کا پیش کردہ جداگانہ انتخاب رد کر کے مشرقی پاکستان کے ہندوؤں کا پیش کردہ مخلوط انتخاب قبول کر لیا تھا۔ نتیجے کے طور پر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مشرقی پاکستان کے نمایندوں پر ہندو ووٹوں کی گرفت مضبوط ہوتی گئی اور اس نے علیحدگی کی تحریک کو مضبوط کیا

-(Ideological Foundation of Pakistan, p 193)

یہ اس لیے ہوا کہ ڈاکٹر وحید قریشی کے مطابق:

جداگانہ انتخاب ختم کر کے بالواسطہ طور پر تسلیم کر لیا گیا کہ مشرقی پاکستان کے ہندو اور مسلمان ایک قوم ہیں (ص ۲۵)۔

سقوط مشرقی پاکستان کا ایک سبب

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مشرقی پاکستان میں علیحدگی پسندی کے رجحان کو پروان چڑھانے والے عوامل متعدد تھے۔ جن عوامل نے اہم کردار ادا کیا ان میں مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے سیاسی قائدین اور افسر شاہی کا رویہ' ضرورت سے زیادہ مرکزیت کا فروغ' وسائل کی تقسیم میں ناانصافی اور جمہوری عمل کا تعطل اور تمام علاقوں کے لوگوں کی اقتدار میں شرکت (political participation) میں کمی کا بڑا حصہ ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اس تاریخی حقیقت کو بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ ملک کی نظریاتی بنیاد کی کمزوری' اور خصوصیت سے نظام انتخاب کی تبدیلی کے ذریعے اسلامی قومیت پر ضرب کاری کا حالات کو خراب کرنے میں بڑا دخل ہے جس کا مقامی ہندو قوتوں اور بھارت نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ مخلوط انتخاب کے نظام کا اس میں بڑا اہم کردار رہا ہے۔ مولانا مودودیؒ نے سقوط ڈھاکہ کے بعد ایک تفصیلی انٹرویو میں حالات کا بے لاگ جائزہ لیا تھا۔ ان کے یہ الفاظ گہرے غور و فکر کے متقاضی ہیں:

علیحدگی کی طرف ایک اور قدم اور بڑا مؤثر قدم مخلوط انتخاب تھا۔ ۱۹۵۶ء میں جس طرح پاکستان کی پارٹیوں نے مل ملا کر ایک دستور بنایا تھا اور اس میں اسلام کی بنیاد پر نظام حکومت تعمیر کرنے کی جو بنا رکھی گئی تھی' اسے اگر کام کرنے کا موقع دیا جاتا تو شاید ان اسباب کی تلافی کی جا سکتی تھی جو ملک کے دونوں حصوں کو علیحدگی کی طرف لے جا رہے تھے۔ لیکن سکندر مرزا صاحب اور سہروردی

صاحب نے زبردستی مخلوط انتخاب کا قانون پاس کر کے اس دستور میں ایک ایسی نقب لگا دی جس سے وہ پاکستان کی وحدت برقرار رکھنے کے لیے کوئی خدمت انجام دینے کے قابل نہ رہا۔ ہم نے اس وقت یہ سمجھانے کی انتہائی کوشش کی کہ مخلوط انتخاب پاکستان کے لیے مہلک ثابت ہوگا۔ اس کے بجائے جداگانہ انتخاب باقی رہنا چاہیے۔ بلکہ وہ بھی اس طرز کا نہ ہونا چاہیے جو انگریزوں نے ہندوستان میں رائج کیا تھا کہ ایک طرف مسلمان تنہا ہوں اور دوسری طرف تمام غیر مسلموں کو ملا کر ایک کر دیا جائے جس کا پورا فائدہ اونچی ذات کے ہندوؤں کو حاصل ہو۔ بلکہ مسلمان، اونچی ذات کے ہندو، آدی باسی ہندو (شیڈولڈ کاسٹ) عیسائی، بودھ، سب کے الگ الگ حلقہ ہائے انتخاب ہونے چاہییں اور آبادی کی بنیاد پر ان کو جداگانہ نمایندگی دینی چاہیے۔ لیکن ان لوگوں کے پیش نظر یہ تھا کہ پاکستان میں اسلامی حکومت کسی طرح نہ چلنے پائے اور یہ ایک سیکولر ریاست ہی بن کر رہے۔ اس لیے مشرقی اور مغربی پاکستان کے مسلمانوں کی سخت مخالفت کے باوجود انھوں نے مخلوط انتخاب کا قانون پاس کر کے چھوڑا۔ یہ اگرچہ اصولی حیثیت سے پورے پاکستان ہی کے لیے غلط تھا، لیکن عملاً اس کا اصل نقصان مشرقی پاکستان کو پہنچتا تھا (سید ابوالاعلیٰ مودودی، روزنامہ جسارت، ۹ دسمبر ۱۹۷۲ء بحوالہ مولانا مودودی کے انٹرویو، اول، ص ۵۱۵-۵۱۶)۔

مخلوط انتخاب کے نتیجے میں سیکولر قوتوں کی تقویت اور متحدہ قومیت کے علم برداروں کی بالآخر کامیابی ایک تاریخی حقیقت ہے۔ پاکستان کو دولخت کرنے اور برعظیم کے نظریاتی نقشے کو تہ و بالا کرنے میں اس تاریخی بھیانک غلطی (blunder) کا بڑا دخل ہے۔

بھارت میں کیا ہوا؟

یہ تو پاکستان کا حشر ہوا۔ بھارت کی کہانی بھی بڑی سبق آموز ہے۔ آزادی کے بعد

کانگریس نے مخلوط انتخاب مسلط کرنے کے لیے سرتوڑ کوشش کی۔ دستور ساز اسمبلی کی متعلقہ کمیٹی نے بڑی رد و کد کے بعد جداگانہ انتخاب کو تو ختم کرنے کی سفارش کی لیکن مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے لیے اسمبلی میں نشستیں مقرر کرنے کا مشورہ دیا۔ اس پر کمیٹی میں اتفاق رائے حاصل کیا گیا مگر دستور ساز اسمبلی میں پھر قلابازی کھائی گئی اور اقلیتوں کے لیے نشستیں مخصوص کرنے کی دفعہ خارج کر دی گئی۔ واضح رہے کہ اس سے پہلے لیاقت نہرو معاہدے میں بھی ایسی ہی عیاری کی گئی تھی۔ اصل معاہدے میں اقلیتوں کے لیے دونوں ملکوں میں نمایندگی کی ضمانت پر دونوں وزرائے اعظم میں اتفاق ہوا تھا۔ این وی گیڈجل (N.V.Gadgil) نہرو کی کابینہ میں وزیر تھا اور معاہدے کے مذاکرات میں بھی شریک، اپنی کتاب "Government from Inside" میں اعتراف کرتا ہے:

اصل معاہدے میں دو پیراگراف تھے جس میں مسلمانوں کے لیے ان کی آبادی کے تناسب سے تمام ملازمتوں میں نشستوں کے تحفظ کو، اور ہندستان کی تمام ریاستوں میں نمایندگی کو تسلیم کیا گیا تھا۔ ایسی ہی دفعات مرکزی اسمبلی کے لیے تجویز کی گئی تھیں (ص ۸۶)۔

شیخ محمد اکرام پاکستانی وفد میں شامل تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس نوعیت کی تجویز مشرقی پاکستان میں ہندوؤں کے بارے میں بھی معاہدے میں شامل تھی مگر پنڈت نہرو اور لیاقت علی خاں کے درمیان اتفاق کے باوجود سردار پٹیل اڑ گئے اور بقول گیڈجل بھارتی کابینہ نے اس حصے کو تسلیم نہیں کیا اور پنڈت نہرو کے اس اصرار کے باوجود کہ وہ لیاقت علی خان سے اس اصول پر اتفاق کر چکے ہیں، کابینہ نے اسے ماننے سے انکار کر دیا (گیڈجل، ص ۸۷)۔ کابینہ کا فیصلہ تھا کہ: ان دونوں تجاویز کو پورے کا پورا مکمل مسترد کر دیا جائے (دیکھیے: Modern Muslim India and the Birth of Pakistan از شیخ محمد اکرام، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۴۶۲)۔

اور یہ سب سیکولرزم کے نام پر!

اقلیتوں کی نمایندگی کی ایک دوسری شکل متناسب نمایندگی کی بنیاد پر انتخاب کے نظام

میں ممکن تھی۔ نہرو رپورٹ (۱۹۲۸ء) میں اس طریق انتخاب کا ذکر ہے بلکہ اس کی افادیت کا اعتراف بھی ہے۔

ہم اس نظام میں بڑی کشش محسوس کرتے ہیں اور اس رائے کے حامل ہیں کہ مختلف طبقوں کے دعووں اور اندیشوں کے حوالے سے یہ واحد معقول اور منصفانہ راستہ ہے۔ اس میں ہر اقلیت کے لیے ایک مقام ہے اور مقابل مفادات اس میں اپنی اپنی جگہ بنا لیتے ہیں۔ ہمیں کوئی شبہ نہیں کہ متناسب نمایندگی مستقبل میں اس مسئلے کا حل ثابت ہو گی۔

لیکن دستور سازی کے وقت کمیٹی کے لوگوں کے اصرار کے باوجود اسے ناقابل عمل کہہ کر مسترد کر دیا گیا حالانکہ خود نہرو رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ: ہم میں سے بیش تر کا خیال تھا کہ ہندستان میں متناسب نمایندگی کو آزمانے میں کوئی ناقابل عبور مشکلات حائل نہیں ہیں۔ (نہرو رپورٹ ۱۹۲۰ء)

چونکہ اصل مقصد اقلیتوں کی آواز کو غیر مؤثر کرنا تھا' اس لیے نہ جداگانہ انتخاب کو باقی رکھا گیا اور نہ اس کی جگہ متناسب نمایندگی کے طریقے کو اختیار کیا گیا۔ سیکولرزم کے نام پر مخلوط انتخاب کو مسلط کیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بھارت میں آبادی کا ۱۲ فی صد (سرکاری اعداد و شمار' ورنہ آزاد اندازوں کے مطابق کم از کم ۱۵ فی صد) ہونے کے باوجود سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا تناسب ۲ فی صد' فوج میں اس سے بھی کم اور مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں میں یہ تناسب اوسطاً ۳ اور ۴ فی صد کے درمیان رہا ہے۔ جب کہ کچھ مقامات پر وہ نمایندگی سے بالکل محروم رہے ہیں جیسے مدھیہ پردیش' جہاں آبادی کا ۵ فی صد ہونے کے باوجود ان کی نمایندگی صفر رہی ہے (ملاحظہ ہو: Reading on Minorities Vol I, تدوین: اقبال انصاری' نئی دہلی' ۱۹۹۶ء' ص ۲۶)۔

رہا سیکولرزم کا ہدف اور قومی یک جہتی کے حصول کا دعویٰ' تو بھارتیہ جنتا پارٹی کا عروج' بابری مسجد کی شہادت اور بھارت سے آزاد ہونے کے لیے ۱۷ تحریکوں کا وجود مخلوط انتخاب کی ناکامی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ملاحظہ ہو راجنی کوتھاری (Rajni Kothari) کا

مضمون (Cultural Context of Communalism in India in Readings on Minorties, Vol II, p 31-47)

بھارت میں جداگانہ انتخاب کے ختم کیے جانے اور مخلوط انتخاب کو مسلط کرنے کا نتیجہ مسلمانوں کو سیاسی طور پر عملاً غیر مؤثر (virtual disenfranclisement) کر دینے کی شکل میں رونما ہوا ہے۔ جب کہ پاکستان میں اس طریق کار نے اسلامی قومیت اور ملکی سالمیت میں گہرے شگاف ڈالے اور بالآخر اس نے ملک میں سیکولر قوتوں کی بالادستی اور عملاً ملک کو دولخت کرنے میں بڑا واضح کردار ادا کیا۔ یہی وہ حالات تھے جن کے تقاضے کے طور پر اور مسلمان عوام کی دلی خواہش اور سیاسی اصرار کے نتیجے میں ۱۹۸۵ء میں پاکستان قومی اسمبلی اور سینٹ نے جداگانہ طریق انتخاب کو بحال کیا جو ۱۹۵۴ء تک ملک میں نافذ رہا تھا۔ اسمبلی اور سینٹ کا فیصلہ متفق علیہ تھا اور اسمبلی میں مسلمان ارکان کے ساتھ غیر مسلم ارکان نے بھی اس کی مکمل تائید کی تھی۔ یہ پاکستان کی نظریاتی بنیاد کو مستحکم کرنے کی ایک کوشش تھی لیکن افسوس کہ اپنی اصل کی طرف یہ مراجعت کچھ سیکولر ذہنیت رکھنے والے عناصر کو بڑی ناگوار گزری ہے اور وہ اس کے خلاف سازشیں کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے' نہ بھارت میں مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کی حالت سے کوئی سبق لینے کے لیے تیار ہیں اور نہ خود اپنی تاریخ سے۔

اقلیتوں کے حقوق کا مسئلہ

ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اصل مسئلہ ریاست اور دین کے تعلق اور ملکی سیاست میں دین کے کردار کا ہے۔ طریق انتخاب کا مسئلہ اس کا ایک جزو ہے اور اس اصل مسئلے کے بارے میں تبدیلی کے لیے زینے کا درجہ رکھتا ہے۔ اگر ریاست کی بنیاد دین پر ہے اور خدا کی حاکمیت کے اصول کی روشنی میں نظام حکومت کو چلنا ہے تو پھر قیادت اور اجتماعی فیصلہ کرنے والے اداروں میں نمایندگی کا انحصار بھی مذہب' تہذیب و

تمدن اور اجتماعی نظام کے نظریاتی رخ پر ہو گا۔ دونوں ایک دوسرے سے اسی طرح مربوط ہیں جس طرح ناخن سے گوشت اور پھول سے اس کی خوشبو۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان ہو یا بھارت، جداگانہ اور مخلوط انتخاب کی ساری بحث دینی اور قومی نمایندگی کے محور پر ہی گردش کرتی رہی ہے۔ جن عناصر کی طرف سے آج یہ بات اٹھائی جا رہی ہے وہ اعلانیہ طور پر سیکولرزم اور دین اور سیاست کی دوئی اور علیحدگی کے علم بردار ہیں، جب کہ وہ تمام افراد اور جماعتیں جو سیاسی نظام کے لیے دین کی رہنمائی کو ضروری سمجھتے ہیں، وہ جداگانہ طریق انتخاب، یعنی نمایندوں کا دینی اور قومی تشخص کی بنیاد پر انتخاب، ضروری سمجھتے ہیں۔

اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت ایک بدیہی امر اور اسلامی ریاست کی دینی ذمہ داری ہے لیکن چند اقلیتی عناصر کو خوش کرنے کے لیے ریاست کی بنیاد کو تبدیل یا کمزور کرنا قومی خودکشی کے مترادف ہے اور پاکستان کے تصور اور تحریک پاکستان کے رہنما نظریے کے خلاف ہے۔ قائداعظم نے صاف الفاظ میں کہا تھا:

> جس دن ہندستان میں پہلے غیر مسلم نے اسلام قبول کیا اسی لمحے پاکستان کے قیام کا آغاز ہو گیا۔ جوں ہی ایک ہندو نے اسلام قبول کیا، اسے نہ صرف مذہبی اعتبار سے بلکہ معاشرتی، ثقافتی اور اقتصادی لحاظ سے بھی اچھوت قرار دے دیا گیا۔ جہاں تک مسلمان کا تعلق تھا، اسلام نے اس پر یہ فرض عائد کر دیا کہ وہ اپنی شناخت اور انفرادیت کو کسی اجنبی معاشرے میں ضم نہ کرے۔ زمانہ قدیم سے عہد بہ عہد ہندو، ہندو رہے اور مسلمان، مسلمان۔ انھوں نے اپنی شخصیتوں کو ایک دوسرے میں ضم نہیں کیا۔ یہ ہے بنیاد پاکستان کی (علی گڑھ میں خطاب، مارچ ۱۹۴۴ء بحوالہ Speeches and Writings of Mr. Jinnah، ج ۳، ص ۲)۔

کیا کوئی سمجھ دار آدمی اس کا تصور کر سکتا ہے کہ اگر یہ فرق پاکستان کی بنیاد ہے تو پاکستان کے بنتے ہی یہ بنیاد غائب ہو جائے گی اور جو دھارے ہزار سال نہ مل سکے وہ مل کر

ایک قوم بن جائیں گے۔ کیا ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد قرآن اور اسوۂ رسالت مآب ؐ بدل گئے؟ کیا ہمارے خیروشر کے پیمانے تبدیل ہو گئے؟ کیا حرام و حلال میں تبدیلی واقع ہو گئی؟ کیا تاریخ و ثقافت نے رنگ بدل لیا؟ کیا آرٹ اور فن تعمیر نے چولا بدل لیا؟ اگر نہیں تو پھر مسلمانوں اور غیر مسلموں کے انتخاب، نمایندگی اور ترجیح کے پیمانے آخر کیوں ایک ہو جائیں۔

اقلیتوں کو ان کے جائز حقوق دینا ہماری ذمہ داری ہے اور خدا اور خلق سے ہمارا عہد ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ریاست کی بنیادوں کو منہدم کر دیا جائے، اس کی منزل کو تبدیل کر دیا جائے اور خود مسلمانوں سے جو عہد کیا گیا ہے اسے دریا برد کر دیا جائے۔ پاکستان کے پہلے وزیراعظم اور قائداعظم کے دست راست خان لیاقت علی خاں نے دستور ساز اسمبلی میں قرارداد مقاصد کی تحریک پیش کرتے ہوئے صاف الفاظ میں کہا تھا:

اس معاملے میں بابائے قوم قائداعظم نے کئی موقعوں پر اپنے جذبات کا اظہار کیا اور قوم نے ان کے خیالات کی بالکل واضح الفاظ میں توثیق کی--- قائداعظم اور مسلم لیگ کے دوسرے رہنماؤں نے اس امر کے حوالے سے غیر مبہم اور واضح [illegible] کیے کہ پاکستان کے لیے مسلمانوں کا مطالبہ اس حقیقت پر مبنی ہے کہ مسلمانوں کا اپنا طریقہ حیات اور طرز معاشرت ہے۔ انھوں نے اس بات کو بھی بار بار دہرایا کہ اسلام محض فرد اور اس کے خدا کے درمیان ایسا رشتہ نہیں ہے جو ریاست کے معاملات کو متاثر نہ کرتا ہو۔

اور قائداعظم کے دوسرے معتمد ساتھی سردار عبدالرب نشتر نے دستور ساز اسمبلی میں ۱۰ مارچ کو اپنے خطاب میں کہا تھا:

یہ صحیح ہے کہ قائداعظم نے اقلیتوں کو ضمانت دی تھی، لیکن قائداعظم نے اکثریت کو بھی اسی طرح ضمانت دی تھی۔ پاکستان کا مطالبہ ایک متعین نظریہ حیات اور متعین مقصد کی خاطر کیا گیا تھا اور یہ قرارداد جو پیش کی گئی ہے ان

سوچی سمجھی اور ٹھوس یقین دہانیوں کے مطابق ہے جو قائداعظم اور مسلم لیگ کے رہنماؤں نے اکثریت اور اقلیتوں کو کروائی تھیں۔

دین کی بنیاد پر دستور اور سیاسی نظام کی تشکیل اور دینی اور تہذیبی تشخص کے مطابق نمایندگی کا اصول اسی وقت طے ہو گیا تھا جب قرارداد مقاصد منظور ہوئی اور جس پر ہمارا دستور مبنی ہے۔ حسین شہید سہروردی اور ذوالفقار علی بھٹو کا مخلوط انتخاب مسلط کرنے کا اقدام ہندو قوتوں اور سیکولر عناصر کے آگے سپر ڈالنے اور پاکستان کے نظریے، مقاصد اور قرارداد مقاصد سے بے وفائی کے مترادف تھا۔ قومی اسمبلی اور سینیٹ کے متفقہ ووٹ کے ذریعے جداگانہ انتخاب کا احیا اس غلطی کی تصحیح تھی جو ماضی میں کی گئی تھی اور جس کا قوم نے عظیم خمیازہ بھگتا تھا۔ آج اس بحث کو اٹھانا ایک بار پھر نظریہ پاکستان اور دستور کی اساس پر تیشہ چلانے کے مترادف ہے اور اسلام اور ملکی مفاد دونوں کے منافی ہے۔

قرآن پاک نے ایک اسلامی ریاست میں نمایندگی کے اصول کو حسب ذیل الفاظ میں بیان کر دیا ہے:

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ ج (النساء ۴: ۵۹) اے ایمان والو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو اللہ کے رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے اصحاب امر ہیں۔

یہاں مِنْکُمْ کی نص صریح نے ہمیشہ کے لیے مسلمانوں میں سے مسلمانوں کے نمایندوں اور اصحاب امر کے انتخاب کے مسئلے کو طے کر دیا۔

اسی طرح قیادت اور اطاعت کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے واضح ہدایت دے دی:

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَہٗ عَنْ ذِکْرِنَا وَاتَّبَعَ ھَوٰئُہٗ وَکَانَ اَمْرُہٗ فُرُطًا (الکہف ۱۸:۲۸) کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو جس کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی اختیار کر لی ہے اور جس کا کام حدود آشنا نہیں ہے۔

مسلمانوں کی قیادت کے اہل وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو خود ان میں سے ہوں، جن کے دل و نظر اللہ کے ذکر سے معمور ہوں، جو اپنی خواہش نفس کو اللہ کی دی ہوئی ہدایت کے تابع کریں اور جو ان حدود کی پاسداری کریں جو خدا اور اس کے رسولؐ نے مقرر فرما دی ہیں۔ صرف ایسے ہی لوگوں کو نمایندگی کے مقام پر فائز کیا جا سکتا ہے۔

ایک اور مقام پر فرمایا گیا:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ (النساء ۴:۵۸) اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں (یعنی ذمہ داری کے مناصب) اہل امانت کے سپرد کرو۔

ان ہدایات پر عمل صرف جداگانہ انتخاب یا کسی ایسے انتخابی عمل ہی میں ممکن ہے جس میں مسلمان اپنے نمایندے خود منتخب کریں اور اسی طرح دوسرے مذاہب کے پیرو بھی اپنے مذہب اور تہذیبی مزاج کے مطابق اپنوں میں سے اپنے نمایندے منتخب کریں۔

میثاق مدینہ سے غلط استدلال

اتنی صاف بات کو خلط مبحث سے پراگندہ کرنے کے لیے چند دانش ور بڑے دور کی کوڑی لائے ہیں اور ارشاد فرمایا ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے میثاق مدینہ میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کو ایک امت قرار دیا تھا اور اسی کی روشنی میں آج بھی ایک اسلامی ریاست میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کو ایک امت تصور کر کے مخلوط انتخاب کا طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اس مضحکہ خیز دلیل پر بے ساختہ کہنا پڑتا ہے کہ:

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے؟

معلوم ہوتا ہے کہ جو حضرات یہ بات بڑے زور و شور سے پیش کر رہے ہیں انھوں نے میثاق مدینہ کا مطالعہ کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی اور محض عنوان دیکھ کر یا سنی سنائی باتوں پر فتویٰ صادر فرما رہے ہیں۔ اس میثاق میں تو مسلمانوں اور غیر مسلموں کو ایک مشترک نظام میں ان کے جداگانہ تشخص کی بنیاد پر مربوط کیا گیا ہے اور ہر ایک کے

جداگانہ تشخص کا ہر معاملے میں لحاظ رکھا گیا ہے۔

اس معاہدے کا متن ڈاکٹر محمد حمیداللہ صاحب کی مرتب کردہ کتاب **مجموعۃ الوثائق السیاسیہ فی العہد النبوی والخلافۃ راشدہ** میں دیکھا جاسکتا ہے جس کا ترجمہ مجلس ترقی ادب لاہور نے "سیاسی وثیقہ جات از عہد نبوی تا خلافت راشدہ" کے نام سے شائع کیا ہے۔ یہ میثاق چھ طبقوں کے درمیان ہے۔ یعنی ۱۔ محمد رسولؐ اللہ ' ۲۔ مسلمانان قریش مکہ (ساکنین شہر مدینہ)' ۳۔ مدینہ کے مسلمان' ۴۔ مدینہ کے یہودی' ۵۔ مدینہ کے نصرانی اور ۶۔ مدینہ کے غیر مسلم۔ اس معاہدے میں بلاشبہ ان چھ گروہوں کو سیاسی طور پر ایک نظام کا حصہ قرار دیا گیا ہے لیکن ہر ایک کو ایک واضح اور متعین گروہ اور جماعت کی حیثیت سے ذمہ داریاں سونپی گئی ہیں اور ہر ایک کی نمایندگی اس کی اپنی قیادت کرتی ہے۔ اس میں مخلوط نمایندگی کا کوئی تصور دور دور نہیں پایا جاتا اور سارے معاملات ہر ہر گروہ کی بنیاد پر طے کیے گئے ہیں' مثلاً دفعہ سوئم شق ۷ کہتی ہے: "مسلمانوں کا ہر فرد یکساں طور پر خدا کی پناہ میں ہے اور تمام مسلمان ایک دوسرے کے دوست اور مددگار ہیں"۔ دفعہ ۴ کی شق ۳ کہتی ہے: "تمام مسلمان اسلام کے احسن اور اقوم طریق پر ثابت قدم رہیں گے"۔ شق ۴ کے مطابق: "کوئی مسلمان کسی مشرک کو مسلمان کے خلاف پناہ نہیں دے گا اور نہ کسی ایسے مال کا ضامن ہوگا جو مشرک نے ناجائز طور پر مسلمان کے مال سے حاصل کیا ہو"۔ شق ۷ میں کہا گیا ہے کہ مسلمان اپنے باہمی تنازعات میں خدا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کرنے کے پابند ہوں گے۔

یہود شرکاے معاہدہ کی ذمہ داریاں الگ بیان کی گئی ہیں اور جہاں ان پر جنگ میں مسلمانوں کی مالی اعانت لازم کی گئی ہے وہیں یہ وضاحت بھی کردی گئی ہے کہ "مسلمان اور یہودی دونوں اپنے اپنے مذہب کے پابند ہوں گے"۔ نیز "مسلمان اور یہودی دونوں اپنے اپنے مصارف زندگی کے خود کفیل ہوں گے اور فریقین میں سے کوئی فرد یا جماعت دوسرے فریق کی حق تلفی گوارا نہ کرے گا"۔ میثاق کے اس حصے میں معاہدے میں شریک ہر ہر جماعت کو مخاطب کر کے قریش مکہ کو پناہ دینے سے روکا گیا ہے اور حملے کی

صورت میں دوسرے گروہ کی مدد کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔ گویا معاہدے کے تمام شرکا ایک ایک گروہ کی حیثیت سے شریک ہیں اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی سب نے حاکم تسلیم کیا ہے مگر اس عہد کے تحت ہر گروہ ایک گروہ کی حیثیت سے اور اپنے اپنے قبائلی سرداروں کے توسط سے مشترک یا الگ الگ ذمہ داریوں کے لیے جواب دہ ہے۔ واضح رہے کہ اس سے پہلے مدینہ میں کوئی مرکزی حکومت نہیں تھی۔ اس معاہدے کے ذریعے ایک نظام قائم کیا گیا۔ اس میں ایک فریق مسلمان تھے جن کی حیثیت اب حکومتی جماعت کی تھی۔ دوسرے وہ لوگ تھے جو حکومتی جماعت کے تابع رہنے کے لیے رضامند تھے اور معاہدے میں شریک تھے۔ سوئم، وہ لوگ تھے جو اس دستاویز کو قبول نہیں کر رہے تھے۔ اس میثاق میں ہر گروہ کے حقوق و فرائض کا تعین بحیثیت فرد ہی نہیں بحیثیت گروہ کیا گیا ہے۔ مثلاً قریش کے مہاجر آپس میں قصاص ادا کرنے کے لیے اپنی سابقہ روایات پر قائم رہیں گے اور اسی طرح وہ اپنے قیدیوں کا فدیہ مسلمانوں کو مروجہ دستور کے مطابق دیتے رہیں گے۔ بنو عوف اپنے افراد کے مابین قصاص کی ادائیگی اپنی روایات کے مطابق کریں گے۔ بنو حارث، بنو ساعدہ، بنو جشم، بنو نجار، بنو عمر، ابن عوف، بنو نبیت، بنو اوس، یہ سب اپنے قبائلی نظام کے تحت اپنی دیت اور اپنے قیدیوں کا فدیہ ادا کریں گے۔

اس معاہدے میں مسلمانوں کے بارے میں یہ شق بھی موجود ہے کہ "تمام اللہ سے ڈرنے والے مسلمان متحدہ قوت سے ان عناصر کے خلاف کارروائی کریں گے جو ان میں بے انصافی اور عصیان یا باہم دشمنی اور بغاوت پیدا کرنا چاہیں گے"۔ نیز یہ کہ "کوئی مسلمان کسی غیر مسلم کی وجہ سے دوسرے مسلمان کو قتل نہیں کرے گا اور نہ وہ کسی مسلمان کے خلاف کسی غیر مسلم کی مدد کرے گا"۔ اسلامی وحدت کی مزید حصار بندی اسی طرح کی گئی کہ "مسلمان دوسروں کے مقابلے میں ایک دوسرے کے دوست اور مددگار ہوں گے"۔

یہودی شرکا کے بارے میں میثاق کہتا ہے کہ "جو یہودی ہمارا اتباع کریں گے، دستور کے مطابق ان کی امداد کی جائے گی، ان کے ساتھ برابری کا سلوک کیا جائے گا، ان پر ظلم

نہیں کیا جائے گا اور ان کے خلاف کسی کی مدد نہیں کی جائے گی"۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہودیوں سے بحیثیت یہودی معاملہ کیا جا رہا ہے اور اگر وہ حکمران جماعت کا اتباع کریں تو ان کے ساتھ برابری کا سلوک کیا جائے گا۔ مسلمانوں کو باہم مربوط کرنے اور ان کی سیاسی سالمیت کی حفاظت کے لیے اس معاہدے میں یہ شق بھی موجود ہے کہ "مسلمانوں کا امن غیر منقسم ہے۔ کوئی مسلمان جہاد فی سبیل اللہ میں دوسرے مومن سے الگ تھلگ ہو کر صلح نہیں کرے گا۔ مجاہدین اسلام ایک دوسرے کی جانشینی کریں گے' نیز "ہر غزوہ میں شریک افراد ایک دوسرے کی نیابت کریں گے" اور سب سے بڑھ کر یہ کہ "ہر مسلمان اپنے مقتولوں کا' جو ان میں شہید ہوں گے' بدلہ لینے کا مجاز اور حق دار ہو گا"۔ اس کا مفہوم یہ بھی ہے کہ اہل اسلام کے خون کا بدلہ لینا اب صرف اقرباہی کی ذمہ داری نہیں رہی بلکہ پوری ملت اسلامیہ اس کی ذمہ دار ہو گی۔ اس اصول کی مزید وضاحت اس شق سے ہوتی ہے کہ "اگر کوئی شخص کسی مسلمان کو ناحق قتل کرے گا تو اسے مقتول کے بدلے قتل کیا جائے گا (الا یہ کہ مقتول کے ورثا دیت لینے پر راضی ہو جائیں) اور تمام مسلمان متحدہ قوت سے اس شخص کی مخالفت کریں گے"۔

یہودیوں کے حقوق و فرائض کی دفعات کا مطالعہ کیا جائے تو وہاں بھی یہودیوں کو ایک جماعت اور گروہ تصور کیا گیا ہے اور ان سے نظام میں شریک ایک گروہ کی حیثیت سے معاملہ کیا گیا ہے۔ "جب یہود مسلمانوں کے ساتھ مل کر لڑ رہے ہوں گے تو اپنے اخراجات کے وہ خود ذمہ دار ہوں گے"۔ آگے چل کر یہود کے تمام قبائل کو ایک ایک قبیلے کا نام لے کر ان کی انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریوں سے باخبر کیا گیا ہے۔

اس معاہدے میں ایک طرف مسلمانوں اور غیر مسلموں کے ایک سیاسی نظام میں مل کر رہنے کا واضح نقشہ موجود ہے تو دوسری طرف مسلمانوں اور غیر مسلموں کے اپنے اپنے جداگانہ وجود کی مکمل حفاظت اور مالی ذمہ داری تک میں علیحدہ علیحدہ نظام کو برقرار رکھا گیا ہے۔ یہ مخلوط نظام کا نہیں' مختلف مذہب کے پیروؤں اور قوموں کے درمیان اپنا تشخص برقرار رکھتے ہوئے منصفانہ اشتراک اور تعاون کا ایک ماڈل ہے۔ مشترک شہریت' اسلام

کی بالادستی، نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم اور آخری اتھارٹی تسلیم کیا جانا اور ہر ہر گروہ کے مساوات اور انصاف کے مطابق حقوق و فرائض اور مالی ذمہ داریوں کا تعین، ان ساری تفصیلات کو دیکھنے کے بعد اگر کوئی اسے مخلوط طریق انتخاب کے لیے نمونہ اور دلیل قرار دینے کی جسارت کرتا ہے تو یہی کہا جا سکتا ہے "شعر مرا بہ مدرسہ کہ برد" اور ؎

یارب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو، جو نہ دے مجھ کو زباں اور

جمہوریت میں اقلیتوں کی حقوق سے محرومی

ہم نے مندرجہ بالا صفحات میں اپنی بات برعظیم کی تاریخ، تحریک پاکستان کی نظریاتی اساس، قائدین تحریک کے وعدوں اور اعلانات، اسلامی ریاست کے مزاج اور مفاد اور پھر قرآن و سنت کے احکام اور نمونے کی روشنی میں کی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سیکولر جمہوریت کے علم برادروں کو خود مغرب کی سیاسی فکر اور لبرل جمہوریت کے اصولوں اور تجربات کا آئینہ بھی دکھا دیا جائے تاکہ ان کے ترکش میں یہ تیر بھی باقی نہ رہے کہ جداگانہ انتخاب کا نظام تو محض مذہبی جنونیوں کے ذہن کی اختراع ہے اور لبرل جمہوریت جس مساوات کی بات کرتی ہے، یہ اس کی ضد ہے۔

یہ دعویٰ کہ مغربی طرز کے جمہوری نظام میں اگر سب شہریوں کو بلالحاظ ان کے عقائد، زبان، نسل، تہذیبی اور ثقافتی تشخص کے ووٹ کا حق دیا جائے تو اقلیتوں کو حقیقی مساوات حاصل ہو جاتی ہے اور اکثریت اور اقلیت کا تصادم اور استحصال ختم ہو جاتا ہے، ایک خواہش تو ہو سکتی ہے مگر حقیقت کی دنیا سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ امریکہ کی میری لینڈ یونی ورسٹی کے علم سیاست و حکمرانی کے پروفیسر ٹیڈ رابرٹ گور (Ted Robert Gurr) نے برسوں کی تحقیق کے بعد ایک کتاب Minorities at Risk (اقلیتیں معرض خطر میں) لکھی ہے جو ۱۹۹۳ء میں واشنگٹن سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں مصنف دعویٰ کرتا

ہے کہ:

سیاسی طور پر سرگرم طبقاتی گروہ کے افراد کی تعداد، جو بیشتر محرومی سے دوچار تھے، ۱۹۹۰ء میں ۹۰ کروڑ تھی یعنی دنیا کی آبادی کا چھٹا حصہ۔ ۱۹۴۵ء کے بعد سے ان میں سے نصف گروہوں نے ان ریاستوں کے خلاف احتجاج، دہشت گردی اور بغاوت کی طویل مہم چلائی جو ان پر حکومت کرتی تھیں (ص ix)۔

دنیا کے ۲۳۳ اقلیتی گروہوں کے حالات کا تحقیقی مطالعہ کرنے کے بعد پروفیسر گور لکھتا ہے کہ گذشتہ ۵۰ سال میں اقلیتوں کے مسائل میں اضافہ ہوا ہے جو تصادم اور تشدد پر منتج ہوا ہے۔

۱۹۵۰ء کے عشرے کے بعد سے ہر طرح کے نسلی و سیاسی تنازعات میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ ہم نے جو تاریخی جائزہ لیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۳۳ طبقاتی گروہوں کی جانب سے کی جانے والی پرامن سیاسی کارروائیاں ۱۹۵۰ء اور ۱۹۹۰ء کے درمیان اپنی وسعت میں دگنی ہو گئیں اور پُرتشدد احتجاج اور باغیانہ کارروائی دونوں چار گنا ہو گئے (ص ۳۱۶)۔

مغربی جمہوریتوں کے ریکارڈ کو پروفیسر گور یوں پیش کرتا ہے=

مغربی جمہوریتوں اور جاپان کی سب کی سب ۲۴ اقلیتوں نے ۱۹۴۵ء اور ۱۹۸۹ء کے درمیان کسی نہ کسی وقت پرامن سیاسی احتجاج کا راستہ اختیار کیا، لیکن ان میں سے نصف نے پرتشدد احتجاج اور نصف نے عسکری سرگرمیاں بھی کیں جن میں دہشت گردی بھی شامل تھی (ص ۳۱۸)۔

کثیر قومی نظام

مسئلے کا حل محض ووٹ کا حق یا مخلوط انتخاب نہیں۔ مسئلے کی جڑیں زیادہ گہری ہیں اور حل کے لیے بالکل نئے فریم ورک کی ضرورت ہے۔ پروفیسر گور تجزیے کے بعد جو

حل پیش کرتا ہے وہ جداگانہ تشخص کو تسلیم کرنا' انفرادی حقوق کے ساتھ اجتماعی حقوق کا احترام اور ہر گروہ کو اس کے تشخص کے مطابق کردار ادا کرنے کا موقع فراہم کرنا ہے جسے کثیر قومی نظام (pluralism) کا نام دیا جا رہا ہے۔

مغربی جمہوریتوں میں' اقلیتوں کے لیے سرکاری پالیسی میں' گذشتہ نصف صدی میں' علیحدگی سے انجذاب اور انجذاب سے کثیر قومی ہیئت کی طرف اور بعض ممالک میں شرکت اقتدار کی طرف ارتقا ہوا ہے۔ کثیر قومی ہیئت سے' جسے شمالی امریکہ میں کثیر ثقافتی ہیئت کہا جاتا ہے' مراد ایسے انتظامات ہیں جو طبقاتی گروہوں کو مساوی' انفرادی اور اجتماعی حقوق کی ضمانت دیتے ہیں۔ ان میں علیحدگی کا حق اور مختلف نظریات رکھنے والے ہم عصروں کی بقاے باہمی کا تحفظ شامل ہے۔ فرانس' امریکہ اور دوسرے مغربی معاشروں میں ۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ء کے عشروں میں کثیر قومی ہیئت اور مرکز سے دور علاقوں اور مقامی لوگوں کو اختیارات کی منتقلی کی طرف رجحان' طبقاتی تنازعات کم کرنے کا باعث ہوا (ص ۳۲۰)۔

مختلف تجربات کا تجزیہ کرنے کے بعد پروفیسر گور کہتا ہے کہ

ایک زیادہ تعمیری اور کھلا جواب یہ ہے کہ کثیر قومی ریاستوں اور نسلی گروہوں کو بقاے باہمی کی ترغیب دی جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ ریاستوں کے نظام کے اندر طبقاتی گروہوں کی تنظیم نو کی جائے اور انھیں مضبوط بھی بنایا جائے۔ ایلسی بولڈنگ (Elsi Bolding) کہتا ہے کہ

طبقاتی گروہوں کو اقتدار کی زیادہ منتقلی سے جدید ریاستوں کے بنیادی ہیئتی مسائل کے حل میں مدد ملے گی۔ ایک زیادہ کثیر قومی عالمی نظام کے مقصد کی طرف ترقی کا تقاضا یہ ہے کہ ریاستیں اور عالمی برادری کے افراد اس طرح کے نئے ظہور پذیر نظام میں اجتماعی حقوق کے لیے مشترک ذمہ داری کو تسلیم کریں۔ طبقاتی گروہوں کو انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اپنے ثقافتی اظہار کے لیے کسی سیاسی دباؤ کے بغیر متعلقہ حقوق حاصل ہونے چاہییں۔ اس قسم کے حقوق کا لازمی تقاضا ہے کہ اپنے

ثقافتی معیار یا سیاسی ایجنڈے کو دوسروں پر مسلط نہ کیا جائے (ص ۳۲۳-۳۲۴)

اسلامی ریاست اور پاکستان کا دستور اقلیتوں کو بعینہ یہی انفرادی اور اجتماعی حقوق اور نظام کار دے رہا ہے اور ہمارے دانش ور اسے جمہوریت اور اصول مساوات سے متصادم قرار دینے کی خدمت انجام دے رہے ہیں!

نسلی تنازعات اور سیاسی تشدد

یونی ورسٹی آف اوٹاوا کے سیاسی فلسفے کے پروفیسر ول کیم لیکا (Will Kymlicka) جسے ۹۵-۱۹۹۴ء کا نظریہ سیاسی کا میک فرسن (Macpherson) انعام دیا گیا ہے' واضح اور مدلل انداز میں صرف جداگانہ انتخاب ہی نہیں' کثیر ثقافتی شہریت (multicultural citizenship) کا نظریہ پیش کر رہا ہے۔ اس کی کتاب Multicultural Citizenship (کثیر ثقافتی شہریت) ۱۹۹۶ء میں آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس سے شائع ہوئی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ آج دنیا کے ۱۸۴ ممالک میں ۶۰۰ لسانی گروہ اور ۵ ہزار نسلی گروہ پائے جاتے ہیں جہاں اقلیتوں اور اکثریتی گروہوں میں مسلسل کش مکش اور تصادم کی کیفیت ہے اور لبرل جمہوریت اس کا کوئی حل پیش نہیں کر سکی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ:

سرد جنگ کے خاتمے کے بعد سے نسلی ثقافتی تنازعات دنیا میں سیاسی تشدد کا سب سے بڑا ذریعہ بنے ہوئے ہیں اور ان میں کمی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے ہیں (ص ۱)۔

نیز یہ کہ:

ان سوالات کے اخلاقی' سیاسی اور کسی منطقی انجام پر پہنچانے والے ٹھوس جوابات تلاش کرنا' آج کی جمہوریتوں کو درپیش سب سے بڑا چیلنج ہے (ص ۱)۔

پروفیسر ول کیم لیکا کی نگاہ میں لبرل جمہوریت نے اس مسئلے کو نظرانداز کیا ہے جو خرابی کی اصل جڑ ہے۔ حقائق کو تسلیم کرنا ضروری ہے۔ وہ مسئلے کے سبب کی نشاندہی

یوں کرتا ہے:

معلوم تاریخ میں سب سے زیادہ منظم سیاسی آبادیاں کثیر نسلی آبادیاں رہی ہیں جو انسانی معاملات میں فتح اور طویل فاصلوں کے رجحانات کے ہمہ وقت موجود ہونے کا ایک واضح ثبوت ہے۔ تاہم مغرب کے سیاسی نظریے کے بیشتر ماہرین ایک ایسے معاشرے کے مثالی ماڈل پر کام کرتے رہے ہیں جس میں تمام ہم خیال شہری ایک مشترک ورثے، زبان اور ثقافت میں شریک ہوتے ہیں (ص ۲)۔

جمہوری نظاموں میں جب تصورات اور زمینی حقائق میں مطابقت نہیں ہوتی تو پھر اقلیتوں کے وجود کو ختم کرنے (physical elimination) کا راستہ اختیار کیا جاتا ہے تاکہ معاشرے میں یکسانی و یک رنگی پیدا ہو جائے۔ اس کا راستہ بڑی تعداد میں ملک بدری (mass expulsion)، نسلی تطہیر (ethic cleansing) اور اجتماعی قتل و خوں ریزی (genocide) رہا ہے۔ جہاں یہ نہیں ہوا وہاں اقلیتوں کو عملاً جبری طور پر اکثریت کی زبان، مذہب اور طور طریقوں کو قبول کرنے پر مجبور کیا گیا ہے۔

لبرل مفکرین کو توقع تھی کہ انسانی حقوق کے تحفظ کے عالمی اور قانونی اقدامات سے اقلیتوں کو تحفظ حاصل ہو گا مگر اقوام متحدہ کا اعلامیہ قومی اقلیتوں کے حقوق کے تصور سے خالی ہے۔ اب یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ اقلیتوں کے حقوق کو محض انسانی حقوق کے ذریعے تحفظ نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے لیے بالکل نئے انداز میں غور و فکر کی ضرورت ہے۔ پروفیسر ول کیم لیکا موجودہ عوامی نمایندگی کے نظام کو ناقص قرار دیتا ہے اور کہتا ہے:

تمام مغربی جمہوریتوں میں اس بات پر تشویش بڑھتی جا رہی ہے کہ سیاسی عمل اس مفہوم میں غیر نمایندہ ہے کہ یہ آبادی کے تنوع کی عکاسی میں ناکام ہے۔ ان میں سے بیشتر ممالک کی مقننہ پر متوسط طبقے، بااثر افراد، ماہرین اور سفید نسل لوگوں کا غلبہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک زیادہ نمایندہ عمل میں نسلی اقلیتوں کے ارکان، خواتین، غریب لوگ اور معذور افراد زیادہ تعداد میں سامنے آئیں گے۔ جو گروہ تاریخی طور پر محرومی کا شکار رہے ہیں ان کی کم نمایندگی ایک واضح امر ہے (ص ۳۱)۔

گروہی بنیاد پر نمایندگی

پروفیسر موصوف لبرل مفکرین کے اس دعوے کو غلط قرار دیتے ہیں کہ اگر کسی اقلیتی گروپ کو گروپ کی بنیاد پر حقوق یا نمایندگی دی جائے تو یہ جمہوری اصولوں سے متصادم ہو گا۔ وہ کہتے ہیں:

لیکن بہت سے آج کے دور کے لبرل افراد کسی نہ کسی طرح اس یقینی نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ اقلیتوں کے حقوق لبرل اصولوں کے ساتھ فطری طور پر متغائر ہیں۔ آج کے لبرل لوگ اصرار کرتے ہیں کہ فرد کی آزادی کے لیے لبرل ازم کا وعدہ اجتماعی حقوق تسلیم کرنے کی نفی کرتا ہے اور انسانی حقوق کے لیے لبرل ضمانت مخصوص گروہی حقوق کو تسلیم کرنے کی نفی کرتی ہے۔ لیکن یہ واضح بیانات، لبرل روایت کا حصہ نہیں ہیں (ص ۶۸)۔

پروفیسر موصوف کا مشورہ ہے کہ:

کسی فرد کی آزادی اس کی قومی گروہ میں شمولیت کے ساتھ وابستہ ہے اور مخصوص گروہی حقوق اقلیتی گروہوں میں مساوات کو فروغ دے سکتے ہیں (ص ۶۹)۔

لبرل افراد، فرد کی آزادی اور سماجی تحفظ کے لیے اپنی بنیادی ضمانت کو قربان کیے بغیر، قومی اقلیتوں اور نسلی گروہوں کے لیے، گروہی بنیاد پر، حقوق کے ایک وسیع دائرے کو تسلیم کر سکتے ہیں اور انھیں ایسا کرنا چاہیے (ص ۱۲۶)۔

چاہے، قومی اقلیتوں کے لیے یہ گروہی حقوق پہلی نظر میں امتیازی محسوس ہوتے ہوں، کیونکہ یہ گروپ ممبر شپ کی بنیاد پر فرد کے حقوق اور سیاسی عمل کا تعین کرتے ہیں، لیکن درحقیقت یہ مساوات کے لبرل اصولوں کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں (ص ۱۲۶)۔

ایک اقلیتی گروہ کی اپنے گروہ کی بنیاد پر نمایندگی کا دفاع کرتے ہوئے پروفیسر موصوف لکھتے ہیں:

کسی گروہ کی نمایندگی فطری طور پر جمہوریت یا لبرل ازم کے خلاف نہیں ہے۔ یہ ہماری موجودہ جمہوری روایات کی ایک قابل فہم توسیع ہے اور ایسے حالات ہو سکتے ہیں کہ جب اقلیتوں کے مفادات اور امکانات کے لیے مناسب نمایندگی کا تعین حاصل کرنے کا یہی طریقہ سب سے موزوں ہو۔ کیونکہ یہ بے حد ضروری ہے کہ اقلیتوں کو سیاسی عمل میں مناسب حصہ ملے۔ اس لیے گروہوں کی نمایندگی کی تجاویز پر انصاف کے ساتھ غوران کا حق ہے (ص ۱۵۱)۔

اس مسئلے کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لے کر جدید ترین جمہوری فکر کا خلاصہ پروفیسر موصوف یوں پیش کرتے ہیں:

اقلیتوں کے حقوق کے بارے میں لبرل فکر اکثر نسل پرستانہ مفروضات، مخصوص واقعات کے غیر ضروری عموم، یا فوری سیاسی حکمت عملی کے دیرپا اخلاقی اصولوں کے ساتھ خلط ملط کا شکار رہی ہے۔ اس کا اظہار وسیع دائرے میں ان پالیسیوں میں ہوا ہے جو لبرل ریاستوں میں تاریخی طور پر نسلی اور قومی گروہوں کے ساتھ اختیار کی جاتی رہی ہیں، یعنی جبر کے ساتھ اپنے اندر جذب کرنا، وفاقیت یا خود اختیاری۔

اس کا نتیجہ بیشتر مغربی جمہوریتوں میں نسلی و قومی اقلیتوں کے ساتھ شدید ناانصافی رہا ہے۔ لیکن اقلیتی حقوق کے لیے ایک مستقل اور اصولی نقطۂ نظر کی تشکیل میں ناکامی کی وجہ سے نئی ظہور پذیر جمہوریتوں کو اس کی قیمت زیادہ چکانی پڑی ہے۔ اگر ان ممالک میں لبرل ازم کو برقرار رہنے کا کوئی موقع ملنا ہے تو اس کو نسلی اور قومی اقلیتوں کی ضروریات اور امنگوں کو واضح طور پر پورا کرنا ہوگا (ص ۱۹۵)۔

قومیت کی بنیاد، زمین یا تہذیب

ہارورڈ یونی ورسٹی کے مشہور فلسفی جان راولز (John Rawls) کی معرکہ آرا کتاب A Theory of Justice نے گذشتہ ۳۰ سال میں انصاف کے مسئلے پر مغرب کے سوچنے کے انداز کو متاثر کیا ہے۔ اس نے اپنی کتاب میں، جو ابھی شائع ہوئی ہے، لبرلزم کے ساتھ لبرل امپریلزم کے خدوخال بھی نمایاں کیے ہیں۔ اس نے عالمی نظام اور اس کے شریک ممالک اور ایک ملک کے اندر پائے جانے والے دینی، تہذیبی، نسلی اور لسانی گروہوں کے بارے میں جس منصفانہ نظام کا نقشہ پیش کیا ہے وہ کثیر قومی ہیئت (pluralism) ہے۔ اس کا خیال ہے کہ سیاسی وحدت کے تصور کا محل قوم کی جگہ انسانی گروہ کو قرار دیا جائے تو زیادہ حقیقت پسند اور منصفانہ نظام وجود میں آ سکتا ہے۔ وہ مزید کہتا ہے کہ قومیت کا تعلق زمین سے زیادہ تہذیب و تمدن سے ہے۔ اس لیے:

یہ افراد اور انجمنوں کے لیے یقیناً بہت اچھا ہے کہ وہ اپنی مخصوص ثقافت کے ساتھ وابستہ ہوں اور سرکاری اور عوامی سطح پر مشترک سرگرمیوں میں حصہ لیں۔

یہ انداز فکر و عمل انسانیت کی ایک حقیقت پسند خیالی جنت (realistic utopia) تک رسائی میں معاون ہو سکتا ہے۔

سیاسی فکر کے یہ تمام رجحانات ان لوگوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہونے چاہییں جو کنویں کے مینڈک کی طرح لبرل جمہوریت اور مساوات کے نام پر مخلوط انتخاب کی دہائی دے رہے ہیں اور محض تنگ نظری اور ضد میں جداگانہ انتخاب پر غیر جمہوری اور مبنی بر تفریق و امتیاز ہونے کی تہمت لگا رہے ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ ان کا رویہ دلیل اور تاریخی حقائق سے مطابقت نہیں رکھتا اور محض تعصب کی عینک سے وہ ایک معقول اور انصاف اور حقیقت پر مبنی نظام کی مخالفت کر رہے ہیں۔

متناسب نمایندگی، پیش رفت کی ضرورت

آخر میں ہم یہ بات بھی کہنا چاہتے ہیں جس کثیر قومی ہیئت کی ہم بات کر رہے ہیں اور جس کے لیے جداگانہ انتخاب ایک اہم ذریعہ ہے، اس کے حاصل کرنے کا ایک اور طریقہ متناسب نمایندگی کا نظام بھی ہے جس میں پارلیمنٹ میں ہر مکتب فکر کی نمایندگی اس کی زمینی اور حقیقی قوت کے مطابق ہو جاتی ہے۔ متناسب نمایندگی کے نظام میں پاکستان کے حالات کی روشنی میں دیگر بہت سے فوائد بھی ہیں جنھیں ہم اپنی کتاب Proportional Representation and the Revival of Democratic Process in Pakistan (متناسب نمایندگی اور پاکستان میں جمہوری عمل کا احیا) میں پیش کر چکے ہیں۔ متناسب نمایندگی کے نظام کے ذریعے ساری خرابیوں کی اصلاح ممکن نہیں لیکن موجودہ نظام کی بہت سی خرابیاں ضرور اس سے دور ہو سکتی ہیں۔ اس سے عوامی اداروں میں بہتر نمایندوں کے آنے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ سیاسی پارٹیوں کے نظام کو مستحکم کرنے میں بھی اس سے مدد مل سکتی ہے۔ البتہ سیاسی جماعتوں کے لیے خود کو زیادہ جمہوری بنیادوں پر منظم کرنا، اپنی کارکردگی میں زیادہ شفافیت (transparency) پیدا کرنا اور عوام اور عدالتوں کے سامنے جواب دہی میں اضافہ بھی ضروری ہوگا۔ جمہوریت کے فروغ اور ارتقا کے لیے نظام انتخاب کی اصلاح بے حد ضروری ہے۔ ان تمام امور کو پاکستان کے حالات اور ضروریات اور اسلام اور معروف جمہوری اصولوں کی روشنی میں جلد از جلد طے کرنے کی ضرورت ہے تاکہ قوم عملی تبدیلیوں کی طرف پیش قدمی کرے۔

(ترجمان القرآن جولائی ۲۰۰۰ء)